لسان العصر اکبر اور جدید ذہن

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لسان العصر نے رحلت فرمائی۔ اگلے روز "زمیندار" میں خبر پڑھ کر اقبال نے اکبر کے فرزند عشرت حسین کے نام تعزیتی تار بھیجا: "دلی ہمدردی قبول فرمائیے۔ ہندوستان ایک عظیم ہستی سے محروم ہو گیا۔"[۱] اس کے ساتھ ہی تعزیتی خط میں تفصیل سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا: "اسلامی ادبیوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے تب جا کے ایک اکبر اسے ہاتھ آتا ہے۔ کاش اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور اس کی بدقسمت قوم کے لئے کچھ عرصہ اور جاری رہتا۔"[۲]

اکبر کی جدائی پر اقبال بہت افسردہ و دل گرفتہ ہوئے۔ یہ کیفیت ان پر کئی روز تک طاری رہی۔ وہ اکبر کا مرثیہ لکھ کر ان کی حیات کو حق و صداقت کے لئے روشن دلیل قرار دیتے ہیں[۳]۔

بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے

۱۶ ستمبر کو مولانا گرامی کے نام ایک خط میں اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کرتے ہیں: "اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے۔ مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیت میں کم بلند نہ تھا..... مسلمانانِ ہند کو اپنے اس نقصان کا شاید پورا پورا احساس نہیں!"[۴]

افراد کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں فانی ہوتے ہیں، قومیں باقی رہتی ہیں۔ اکبر کی رحلت کے سترہ سال بعد اقبال بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ملت اسلامیہ کے احیاء کے لئے جو تاریخی کردار ان ہستیوں نے انجام

دیا، اس سے انکار ممکن نہیں۔ اور یہ کہنا بھی بعید از حقیقت نہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان ہستیوں کا معنوی فیض جاری ہے۔ کیونکہ اپنے فکر وفن سے جو تہذیبی جنگ انہوں نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لڑی اس کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ حصول آزادی کے بعد اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس لئے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے اکبر اور اقبال کا پیغام از بس تازہ بھی ہے اور از حد ضروری بھی! اکبر نے ساری عمر الحاد اور بے دینی کے خلاف جہاد کیا اور مغربی تہذیب سے، جس کے جلو میں الحاد و بے دینی کا سیلاب آیا، جنگ جاری رکھی۔ یہ وقتی جنگ نہیں تھی، ایک طویل محاذ آرائی تھی، جس کے نتائج مہینوں اور برسوں میں نہیں بلکہ قرنوں اور صدیوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اکبر کے بعد اقبال نے بھی یہ جنگ اپنے ہتھیاروں (فکر وفن) سے جاری رکھی۔ اکبر اپنے دور کے حالات کے مطابق مدافعانہ جنگ لڑتے رہے۔ اقبال نے جارحانہ انداز میں دورِ حاضر کی تہذیب جدید کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ ہماری موجودہ نسلیں ابھی جنگ کی حالت میں ہیں، اور آنے والی نسلوں کو بھی یہ جنگ لڑنا ہوگی۔ اب شکست خوردہ حریف مدافعت پہ اُتر آیا ہے۔ مغربی تہذیب اپنے الم ناک انجام سے دوچار ہونے والی ہے! صرف ایٹمی چھتر اس کو اس کے بھیانک انجام سے بچائے ہوئے ہے!

ایک زمانہ تھا جب ترقی پسند دانشوروں نے اکبر کو رجعت پسند اور قدامت پرست قرار دینا اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ یہی صورت اقبال کے بارے میں بھی پیش آئی۔ لیکن یہاں مقابلہ ذرا سخت تھا، اس لئے دانشوروں نے کئی پینترے بدلے اور اب تک بدل رہے ہیں۔ چونکہ مسئلہ حق و صداقت کی تلاش کا نہیں بلکہ اپنے اپنے عقیدوں کی محکمی و استواری کا ہے، اس لئے دانشوروں کی یہ نکتہ چینی اکثر اعتراض برائے اعتراض یا سیاق و سباق سے الگ کرکے اکبر و اقبال کے افکار کا حلیہ بگاڑنے تک محدود رہی۔

اکبر کو "ترقی پسند" دانشوروں کی اس تنقیدی یلغار کا پورا پورا احساس تھا۔ اس لئے شیریں لبوں کی ترقی پسندانہ گالیوں کا جواب ان کے پاس ایک ہی تھا:

خدا کی پاکی پکارتا ہوں   ہوا کرے ناخوشی بتوں کو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مشن کو اکبر نے اپنی حیات مستعار کے آخری لمحوں تک جاری رکھا۔ ان کو رضائے الٰہی کی تمنا تھی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی آرزو۔ دانشوروں کی داد و ستائش سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے :

گو اپنے ساتھ آپ کا مُہرا نہ لے گیا　　　اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

کلام اکبر کا مطالعہ کیا جائے تو گذشتہ اور موجودہ صدی کی کشمکش کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس زمانے کا شاید ہی کوئی واقعہ یا مسئلہ ایسا ہوگا جو لسان العصر اکبر کی نظر سے اوجھل رہا ہو۔ ان کے نکتہ رس ذہن نے ظریفانہ انداز میں یا سنجیدہ پیرائے میں ہر اس بات کا نوٹس لیا جو قومی زندگی یا تہذیب و معاشرت پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ ان میں بعض وقتی اور ہنگامی باتیں بھی ہیں اور ایسی باتیں بھی جو ملک اور قوم کی تقدیر اور تاریخ بنا رہی تھیں۔ نکتہ چینوں کو اکبر کے ہاں پائپ کے پانی اور ٹائپ کے حروف سے لے کر پیئرس سوپ، ڈارسن کے بوٹ، سولا ہیٹ، جاکٹ و پتلون، مس کے لونڈر اور بیگم کے عطرِ حنا تک بے شمار چھوٹی چھوٹی چیزوں کا اتا پتا مل جائے گا اور وہ اپنی تخلیقی تنقید کے شوقِ فضول کی تسکین کے لئے اکبر پر جو تہمتیں چاہیں لگا سکتے ہیں۔ لیکن بنظر انصاف دیکھا جائے تو کلام اکبر کا یہ حصہ جو آج سطحی اور فروعی باتوں کا آئینہ دار نظر آتا ہے دلچسپ ہونے کے باوجود مقدار میں بہت تھوڑا ہے۔ اکبر کی ظرافت کو بھی یار لوگوں نے بہت اچھالا اور اس میں شک نہیں کہ اکبر کا ظریفانہ اسلوب ان سے مختص ہے۔ لیکن ایک تو یہ ظرافت ان کے آنسوؤں کی پردہ دار ہے، دوسرے یہ ظریفانہ کلام بھی ان کے مجموعۂ کلام میں مقدار کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں۔ اکبر کا سنجیدہ، عارفانہ کلام جس میں حکمت و دانش کے بیشمار موتی بکھرے ہوئے ہیں، کیفیت و کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ ہے لیکن اس پر ہمارے دانش مندوں نے بہت کم توجہ فرمائی ہے۔ عرصہ ہوا، اکبر کی سنجیدہ شاعری پر ایک مضمون علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں میری نظر سے گذرا تھا۔ ورنہ عام نقادوں نے اس حقیقت کا احساس ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کو سمجھنے میں بہت کوتاہی ہوئی ہے۔

کلام اکبر کے کئی اہم اور مستقل پہلو ہیں جن پر غور کیا جائے تو ان پر طویل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم

اس وقت تین اہم "رجحانات" پر جو ذہن جدید کو متاثر کرنے والے ہیں، نہایت اختصار سے گفتگو کریں گے۔ یہ رجحانات سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں ہیں۔

سیاسی حالات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوامل بدلتے رہتے ہیں لیکن تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو یہ ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں نظر آئیں گے۔ اسی لئے اقبال نے تاریخ کو قومی حافظے سے تشبیہ دی ہے[(۵)]۔ اگر اس حافظے سے ماضی کے واقعات کا ریکارڈ محو کر دیا جائے تو حال بے معنی ہو جائے گا اور مستقبل کے بارے میں کوئی صورت سوچی بھی نہ جا سکے گی۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی تک ہماری پچھلی اور موجودہ نسلوں کو بے شمار مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ان میں تین مراحل بڑے واضح ہیں۔ پہلا مرحلہ ۱۸۵۷ء کے بعد نصف صدی تک پھیلا ہوا ہے جس میں شکست خوردگی اور احساس کمتری کا رجحان غالب رہا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز سے سیاسی بے چینی اور بے اطمینانی کا لاوا پکنے لگا اور محکومی کا احساس شدت سے قلب و ذہن کو متاثر کرنے لگا۔ یہ رجحان پہلی جنگ عظیم تک نتیجہ خیز مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اور پھر تیسرا رجحان تحریک خلافت اور ترک موالات کی گرمی ہنگامہ کی صورت میں نمودار ہوا جس نے برطانوی استعمار کی بنیادوں کو ہلا دیا اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ اصلاحات کی رفتار کو تیز کرے اور جلد از جلد یہاں سے رخصت ہو جائے۔ دوسری جنگ عالمگیر نے اس رجحان کو اس کے منطقی انجام سے قریب تر کر دیا۔ نتیجتہً برصغیر کو آزادی ملی اور بھارت اور پاکستان دو آزاد ملک معرض وجود میں آئے۔

لسان العصر اکبر کو اس تاریخی عمل میں جس دور سے سابقہ پڑا، وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی شکست خوردگی کے احساس سے لے کر تحریک خلافت اور ترک موالات تک کا زمانہ ہے۔ جنگ آزادی کا ہنگامہ برپا ہوا تو اکبر گیارہ بارہ سال کے تھے۔ تحریک خلافت عروج پر تھی جب انہوں نے رحلت فرمائی۔ پہلے دو مرحلوں کے نشانات کلام اکبر میں بڑے واضح ہیں اور آخری مرحلے کے بارے میں حکیمانہ اشارات ملتے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں تو اکبر کے ہم نوا، راز داں اور بھی پیدا ہو چکے تھے۔ اقبال، ظفر علی خاں، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام

آزاد، حسرت موہانی، جن کی للکار و پکار نے حوصلوں میں جولانی پیدا کر دی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے شکست خوردہ ماحول میں اکبر کو یہ جنگ تنہا لڑنی پڑی :

ہے اکبر بے کس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف !

اکبر نے برطانوی استعمار کے خلاف محکوم اور لاچار قوم کی یہ جنگ شعری فنون کے ایسے ہتھیاروں سے لڑی جو ان کے اپنے تیار کئے ہوئے تھے۔ سرد موسم کی برفبار ہواؤں میں شاہد معنی نے ظرافت کا لحاف اوڑھ کر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس زمانے میں کسی حریت پسند کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا :

پالسی ان کی ہے قائم ہماری دل لگی

صاحب کی استعماری پالیسی اور اس کے بارے میں اکبر کی یہ دل لگی ہماری تاریخی جدوجہد کا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا جس کی اہمیت کا اعتراف ابھی تک نہیں کیا جا سکا۔ اکبر کے سیاسی افکار کا جائزہ لیں تو یہ منظر نگاہوں کے سامنے آئے گا کہ جب برصغیر میں سیاسی عمل مفقود تھا، ملک میں صرف ایک طاقت نظر آتی تھی اور وہ برطانوی شہنشاہیت تھی، خاص و عام سب اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے، اکبر بھی اس ہجوم میں شامل ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی مقطعے میں آ کر یہ سخن گسترانہ بات بھی کہہ جاتے ہیں :

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر　　　تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے ڈیم فول بھی ہے !

محکوموں کی بے حسی پر عبرت کا یہ تازیانہ برسانا اور حاکموں کی فرعونیت پر طنز کا یہ تیر چلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اکبر کا یہ شعر تو اکثر زبان پر آ جاتا ہے :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

صنعت تلمیح کے پردے میں استعماری نظام تعلیم پر اس سے بہتر تنقید اور کیا ہو سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے اپنی نظموں اور غزلوں میں جا بجا بڑے بلیغ انداز میں اس دور کے سیاسی ماحول کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ظرافت، شوخی اور تغزل کے دلفریب پردوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ہمیں اکبر کی ذات میں ایک جری سیاسی مفکر چھپا ہوا نظر آئے گا۔ تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ایک غزل کے ان دو شعروں کو لیجئے اور

غور فرمائیے کہ کس طرح اکبر اپنے عہد کے سیاسی حالات کو ان شعروں میں سمو گئے ہیں۔ پہلا شعر ہے ۔

کاش نادم ہوں یہ احسان جتانے والے　　بارِ احساں جسے کہتے ہیں وہ ہے کوہِ جفا

WHITE MAN'S BURDEN کی تاریخی اصطلاح کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کو دوبارہ پڑھیے۔ استعماری عمل اور اکبر کے فکری ردعمل کا مفہوم پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

دوسرا شعر ہے :

اونٹ کانٹوں پہ لپکتے ہی رہے　　گائیں سبزہ پا گئیں کر کے کلیل

اکبر کی شعری علامات میں گائے ہندو قوم اور اس کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور اونٹ مسلم قوم کی۔ اب اس شعر کو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کے آئینے میں دیکھیے جب ہندو قوم برطانوی حکومت سے تعاون کر کے سرخرو ہو رہی تھی اور مسلمان نشانۂ عتاب و انتقام بنے ہوئے تھے۔

ایک شعر اور ملاحظہ کیجئے، تحریک خلافت اور ترک موالات کے زمانے کا ہے، وضاحت کی ضرورت نہیں:

شوکت سے کیوں نہ کھٹکیں ان کی تو ہسٹری ہے　　گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن کی مسٹری ہے

اکبر کا سیاسی تفکر اور کردار ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو گیا ہو گا۔ اکبر کی شاعری کا یہ پہلو جدید ذہن کے لئے بڑا سبق آموز ہو سکتا ہے۔ زمانۂ محکومی میں استعمار کا رنگ روپ کیا تھا۔ ہندو مسلم تعلقات کس نہج پر جا رہے تھے، اور مستقبل قریب میں اس کے کیا نتائج نکلنے والے تھے، یہ باتیں ہمیں کلام اکبر میں ملیں گی۔ اکبر کے بہت سے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ کچھ باتیں وقتی حالات کے ساتھ رفت گزشت ہو گئیں۔ بہرکیف خودشناسی کے نقطۂ نظر سے یہ موضوع پرانا ہونے کے باوجود نیا ہے۔

اب میں دوسرے رجحان یعنی مغربی تعلیم کے نازک مسئلے کی طرف آتا ہوں۔

جدید تعلیم کا مسئلہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں ایک اہم بلکہ بنیادی اور اختلافی مسئلے کے طور پر ہماری قومی زندگی کو متاثر کر چکا ہے۔ جدید تعلیم سے مراد اگر محض مغربی علوم کی تحصیل ہوتی، تو شاید کوئی بھی صحیح الخیال انسان اس کی مخالفت نہ کرتا، اور نہ اس کی افادیت کو شک کی نظروں سے نہ دیکھتا۔ لیکن اصل مسئلہ تو اس غرض و غایت کا تھا جو

نئی تعلیم کے جاری کرنے میں کارفرما تھی۔ اور یہ غایت بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ برصغیر کے پہلے تعلیمی کمیشن کے چیئرمین لارڈ میکالے نے اپنی تعلیمی روداد میں جدید تعلیم کے استعماری مقصد کو نمایاں طور پر بیان کر دیا تھا "ہمیں اس وقت لازماً ایک ایسا طبقہ بنانا چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو، اور یہ طبقہ ایسا ہونا چاہیئے جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق اور رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہو۔"(۶)

میکالے کے بیان کردہ اس مقصد کو سامنے رکھیئے اور جدید مغربی تعلیم پر لسان العصر کی تنقید کو دیکھئے، تو اس بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہے گا۔ اکبر مغربی علوم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ تو اس استعماری سرکاری تعلیم کے مخالف تھے جس کا مقصد قوم کے نونہالوں کو ذہنی اصطباغ دینا تھا:

صیاد ہنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے ‎ ‎ بلبل کے لئے کیا مشکل ہے اُلّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

یہ وہ نازک مسئلہ تھا جس پر اکبر بقول اقبال "مغربی تعلیم کے بارے میں سر سید احمد خاں کے ساتھ مدۃ العمر لڑتا جھگڑتا رہا۔ آج ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بیچارے قدامت انتساب شیخ کا خوف کچھ بے بنیاد نہ تھا۔"(۷)

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے ‎ ‎ دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

مسیحی پادری تو ہماری قوم کے بچوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن استعماری تعلیم نے انہیں ذہنی اصطباغ دے کر اپنے حسب و نسب سے بیگانہ بنا دیا:

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا ‎ ‎ شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ ‎ ‎ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا!

جدید تعلیم کے نام پر علوم سے زیادہ مغربی کلچر کی نقالی اور انگریزی زبان سے زیادہ انگریزیت کی طرف میلان بڑھا۔ اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بلکہ آزادی سے قبل سیاسی تحریکوں کی بدولت جو تھوڑا بہت حجاب تھا یا قومی شعور ابھرا تھا۔ وہ بھی آزادی کے بعد ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ اور مغربی کلچر اور انگریزیت کا شوق ایک خاص طبقے میں جنون کی حد تک بڑھ گیا ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔ کہیں یہ طبقہ وہی تو نہیں جس کا تخیل میکالے کے ذہن میں پیدا

ہوا تھا ؟

آزادی کے بعد تعلیمی جہت کو درست کرنے اور اسے قومی مقاصد سے ہم آہنگ بنانے کے لئے کئی تعلیمی کمیشن بٹھائے گئے۔ لیکن ہر کمیشن کاغذی کارروائیاں کرکے رخصت ہو گیا۔ میکالے کا نظریۂ تعلیم آج بھی اسی طرح کامیاب ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ کامیاب۔ اب ہر کوئی انگریز سے زیادہ انگریزی کا دلدادہ، انگریزی سے زیادہ انگریزیت کا شیدائی ہے۔ اندریں حالات، اکبر کے تعلیمی افکار آج بھی ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتے ہیں۔ انہوں نے مغربی علوم کی مخالفت نہیں کی۔ البتہ قومی تعلیم کے لئے ایک غایت کی نشاندہی ضروری کردی ہے :

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبر کے نزدیک علم کی منتہائے مقصود تو یہ ہے :

علم وہ خوب ہے جو حسن عمل تک پہنچے ذوق وہ خوب کہ جو رازِ ازل تک پہنچے

تعلیمی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اکبر نے کچھ ترجیحات بھی قائم کی ہیں۔ قومی تشخص کے نقطۂ نظر سے انہوں نے دینی اور اخلاقی پہلوؤں پر خاص زور دیا ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے تجرباتی سائنس اور صنعتی تعلیم کو اولین حیثیت دی ہے۔ پھر ادب اور آرٹ کے مضامین آجاتے ہیں۔ فلسفہ چونکہ ذہنوں میں تشکیک پیدا کرتا ہے، اس لئے فلسفے سے خود دلچسپی رکھنے کے باوجود اکبر نے فلسفے کی تعلیم سے عام طور پر بچنے کی تلقین کی ہے :

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی سعی کا موقع ملے تو آرٹ یا سائنس سیکھ
عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے لطف کیا ہے لد لیے موٹر پہ زر کے زور سے

جدید تعلیم پر اکبر کی تنقید اور پھر مثبت انداز میں ان کی تلقین کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اکبر کا نظریۂ تعلیم گذشتہ دور ہی میں نہیں، آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

اب میں تیسرے رجحان یعنی تہذیبی پہلو کی طرف آتا ہوں۔

سیاسی محکومی اور اس کے بعد استعماری تعلیم کی بدولت ذہنی محکومی کا کڑوا پھل جدید تہذیب و معاشرت کی

صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر اور اقبال دونوں کو اپنے اپنے زمانے میں اس محاذ پر سخت معرکہ آرائی کرنی پڑی۔ سرسید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کرکے اپنی "وحشی" قوم کے سامنے یہ نصب العین رکھا کہ وہ کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرے(۹)۔ "کامل درجے کی تہذیب کا یہ تصور انہوں نے مغرب سے لیا تھا۔ تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔"(۹)

سرسید احمد خاں بڑے ہی مخلص تھے اور بقول حالی "قوم کے سچے ہی خواہ تھے"(۱۰)۔ وہ اسلامی درد سے بھی بہرہ ور تھے۔ یہ سب باتیں بجا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا یہ اقدام یا تجربہ نہایت خطرناک عواقب کا پیش خیمہ تھا۔

بقول اکبر: "سر میں تھا سید کے قرآں زیرِ پا میخانہ تھا!"

احساس شکست میں مبتلا محکوم قوم کو یہ مشورہ دینا دو احوال سے خالی نہ تھا۔ یا تو وہ انگریزوں کی طرح "سراپا مہذب" بن جائے اور یا پھر جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے بھی ہاتھ دھو کر نہ ادھر کی رہے نہ ادھر کی:

مرید دھر ہوئے وضع مغربی کرلی — نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی

اکبر کے لئے یہ ساری صورت حال بڑی الم انگیز تھی۔ ان کے نزدیک یہ وقت نئے تجربات کے لئے موزوں نہیں تھا:

"کہ فرط ضعف نہیں وقت آپریشن کا"

اکبر کے انتباہ کی پرواہ نہ کی گئی۔ تجربے ہوتے رہے۔ نئی نئی آنچیں لگتی رہیں اور ان میں بے کس قوم پگھلتی رہی۔ نہ مشرقی رہی، نہ مغربی بنی۔ عجیب و غریب سانچے میں ڈھلتی رہی۔ اور اکبر بھی اپنے عجز و انکسار کے باوجود ساری عمر یہ تہذیبی جنگ لڑتے رہے۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ مغربی تہذیب اپنے ساتھ الحاد، بے یقینی، نفس پروری، بے اخلاقی، بے راہ روی کا سیلاب لا رہی تھی۔ اکبر سیاسی محکومی کا کڑوا گھونٹ ظرافت کی حلاوت کے ساتھ حلق سے نیچے اتار سکتے تھے۔ ایک طالب صادق کی طرح مغربی علوم کو بھی خوش آمدید کہہ سکتے تھے۔ لیکن یہ تہذیبی مرحلہ ان کے لئے، ان کی قوم و ملت کے لئے سخت آزمائش کا تھا۔ یہاں سپر اندازی کا مطلب قوم کی مکمل

شکست اور ہمیشہ کی ذلت و رسوائی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا :

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس   ہے ابتریٔ معاشرت کا افسوس
انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا   ہے اپنے ہی مَیلِ معصیت کا افسوس !

کیونکہ "طالب حق کو فلک نے ان کا طالب کر دیا" تھا۔ اکبر کا غیر متزلزل عقیدہ تھا کہ آقا و مولائے یثرب کی متعین کردہ راہ سے ہٹ کر ہماری تہذیب و معاشرت کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ حجازی تہذیب، باخدا تہذیب ہے اور اسلامی معاشرت حیادار معاشرت ہے۔ اس کی عبادات، اس کے معاملات، اس کی تفریحات، اس کا لباس، اس کی خوراک، اس کی رہائش، اس کے اسلوب حیات کے جملہ مظاہر عقیدۂ توحید و رسالت سے پھوٹتے ہیں موسمی اور مقامی تنوعات کے باوصف یہ تہذیب اپنے ہی محور یعنی دین حق کے گرد گھومتی ہے۔ دین سے بیگانہ ہو کر مسلمان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا۔ اس لئے اکبر ایسی مفاہمت کے قائل نہ تھے جس میں دین کو ہاتھ سے دینا پڑے"[11] مصلحین قوم اور اکبر میں نزاع کا باعث درحقیقت اکبر کا یہی بے لچک رویہ تھا جو انہوں نے دین کے دفاع کے لئے ساری عمر اختیار کئے رکھا :

دل ہی دیتا تھا یہ، وہ دین بھی کرتے تھے طلب   یہی باعث ہے کہ اکبر کی بتوں سے نہ بنی !

ہم یہ نہیں کہتے کہ سرسید احمد خاں کو اس تجربے کی ہلاکت آفرینی کا احساس نہیں تھا۔ یہ تو ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک جری مصلح تھے، اور ان کی "ڈسپاٹک" طبیعت میں انتہا پسندی موجود تھی۔[12] اس معاملے میں سرسید کے رفقاء نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولوی سمیع اللہ خاں، حالی، شبلی، نذیر احمد کے خیالات ان سے بہت مختلف اور اکبر کے بہت قریب تھے۔ خود سرسید کو بھی آخری زمانے میں اپنے تجربے کی ناکامی کا احساس ہو گیا۔[13] کیونکہ نئی نسل جس رنگ میں سامنے آئی اس کا تو وہ تصور بھی نہ کرتے تھے :

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے   نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

تہذیبی جنگ کا یہ سلسلہ اکبر اور سرسید کے دور سے گزر کر کئی مرحلے طے کر چکا ہے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی اس کا رخ بدلا۔ اقبال نے بھی تہذیب حاضر کے خلاف اعلان جنگ کر کے اس کے دباؤ کو بڑی حد تک کم کیا۔ لیکن کچھ ایسے

حقائق بھی سامنے آتے ہیں جو مسلمانوں کے مزاج کے حوالے سے ذرا غور طلب ہیں۔ ایک کھٹک قلب و ذہن میں اکثر محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو غیروں سے زیادہ اپنوں سے کیوں نقصان پہنچتا ہے؟ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک موقع پر اینٹی گاڈ سوسائٹی بنی۔[۱۴] یہ شرف بھی ایک مسلم یونیورسٹی ہی کو حاصل ہونا تھا۔ کسی دوسری یونیورسٹی کو یہ اعزاز نہ مل سکا۔ پھر ملحد اساتذہ کی کمین گاہیں بھی مختلف محمڈن اینگلو اورینٹل یا اسلامیہ کالجوں میں ہی موجود رہیں۔ کسی دیانند اینگلو ویدک کالج، کسی سناتن دھرم کالج، کسی خالصہ یا مشن کالج کو یہ توفیق کبھی نصیب نہ ہو سکی!

وہ تو گرجا پر رکا اور یہ گیا کعبے کو پھاند!

کوئی تحقیق کرنا چاہے تو یہ موضوع عبرت آموز ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے کہ جو تعلیمی ادارے غریب مسلمانوں کے چندے سے بنے، ان میں اسلام کے خلاف یہ مورچے کیونکر قائم ہوئے؟ وجہ یہ ہے کہ مسلمان جب تک اپنے عقیدے اور ایمان پر قائم رہتا ہے، وہ فاسق و فاجر بھی ہو، پھر بھی اس میں قومی غیرت و حمیت باقی رہتی ہے۔ عقیدے سے منحرف ہو کر وہ اللہ و رسول ہی کا باغی ہی نہیں ہوتا بے غیرت بھی ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دور حاضر کی اس تہذیبی جنگ یا معرکہ روح و بدن کے سلسلے میں اکبر کا جدید ذہن سے کیا تعلق ہے؟

یہ امر اب کوئی راز نہیں کہ تہذیب مغرب نزع کی حالت میں ہے۔ بھاپ سے گزر کر ایٹمی توانائی تک رسائی حاصل کر لینے اور چاند تک پہنچ جانے کے باوجود اہل مغرب کو دھرتی پر سیدھے سبھاؤ چلنا نہیں آیا۔ مشرق کا انسان تو ان کے ہاتھوں دکھی تھا ہی، اب خود ان کا گھر بھی دکھوں کی آگ سے جل رہا ہے۔ بدن پھنک رہا ہے، روح تڑپ رہی ہے۔ اکبر نے شاید اسی وقت کی پیش گوئی کی تھی:

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے ۔۔۔ ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

آخر یہ ہزاروں، لاکھوں ہپی کس خوشی میں در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں؟ یہ اجتماعی خودکشیاں کیوں ہو رہی ہیں؟ حقیقت میں یہ اس مادر پدر آزاد تہذیب کے مایوس العلاج مریض ہیں جنہیں "کھاؤ پیو اور عیش کرو" کا سبق دیا گیا تھا۔ اب یہ اس عیش مسلسل سے اکتا گئے ہیں۔ ان کی حیوانی خواہشات کی تسکین نہ خمر و خنزیر سے ہو رہی ہے، نہ چرس و افیون سے۔ اس تہذیب کا بھیانک انجام اب کوئی دور نہیں۔ لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہمارے

کھاتے پیتے خوشحال گھرانوں کے چشم و چراغ ابھی تک اس لب گورِ تہذیب کے صیدِ زبوں بنے اپنی : نیا و عاقبت خراب کر رہے ہیں!

دوسری طرف عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ سیاسی محکومی کی زنجیریں توڑ کر حریت فکر و عمل کا متلاشی ہے۔ مسلم نوجوان اس کا ہراول ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے جس کے جلو میں پندرھویں صدی ہجری کا آفتاب عالمتاب اگلے سال طلوع ہو رہا ہے! اسلامی دنیا کی پسپائی کا زمانہ ختم ہوا۔ اب اس کی کارفرمائی کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اس عالم میں اکبر اور اقبال اسلامی دنیا کے بہت بڑے فکری رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے سامنے اس عصر نو کی سحر بے حجاب تھی[11]۔ اکبر شب رفتہ کے مسافر تھے۔ لیکن اس مرد حق آگاہ نے کفر و الحاد کی اس شب تار میں بھی حجازی تہذیب کے چراغ کو اپنے آنسوؤں سے روشن رکھا اور اعلائے کلمۃ الحق سے کبھی منہ نہ موڑا!

وجد میں آئے حیرتوں میں رہے عجز کے ساتھ لب کشائی کی
بندگی کا صلہ ملے نہ ملے داد دے دی مگر خدائی کی

حواشی

۱-۲ - حیات اکبر، تالیف عشرت حسین : تسوید ملا واحدی

۳ - پیام مشرق، طبع اول۔

۴ - مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۷۷۔

۵ - رموز بے خودی۔

۶ MACAULAY, T.B. MINUTES ON EDUCATION IN INDIA 1862 - P 115 -

۷ - "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" مشمولہ مقالات اقبال، ص ۱۳۲۔

۸ - تمہید پرچہ "تہذیب الاخلاق"

۹ - مسافران لندن، ص ۱۸۵۔

۱۰ - حیات جاوید (دیباچہ)

۱۱ - یہی بات اقبال نے بڈھے بلوچ کی زبانی ارشاد فرمائی ہے :

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت   ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

(ارمغان حجاز)

۱۲- مولانا حالی نے سرسید کے اس رجحان کا ذکر "حیات جاوید" میں کیا ہے ص ۲۲۲ -

۱۳- سرسید نے اپنے مکاتیب میں اور ان کے رفقا نے اپنی تحریروں میں اس احساس کا اظہار کیا ہے۔

۱۴- بحوالہ "مکتوبات اقبال" بنام سید نذیر نیازی، ص ۲۰۰ تا ۲۰۴

۱۵- مسجد قرطبہ کے آخری بند کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

آب روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی   دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں   میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے   لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

(بال جبریل، ص ۱۳۶)